

پہلو سے یہ لوگ بھی ایک غیر اسلامی نظام حکومت میں بادشاہی کے منصب پر فائز تھے دوسری طرف ان کی ذاتی خدا ترسی، تقویٰ اور احساس ذمہ داری، انہیں کسی غیر اسلامی فعل سے روکتی اور قانون شریعت کے اجراء و نفاذ پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح پرانے نیک بندوں نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے گویا دو متناقض چیزوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی۔ اس میں یہ کہاں تک کامیاب ہوئے، تاریخ کے صفحات اس کا جواب دیں گے۔ اسلامی تحریک کی تاریخ میں بہر حال ان کا ایک مقام ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۱۱۲ - ۱۱۷۴ھ | اب ہم بارہویں صدی کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ وہ جسے ہندوستان میں "ناموس ملت کا آخری پاسبان" کہا جاتا ہے، اس کے جانشین ایسے کمزور اور بوسے ثابت ہوئے کہ نصف صدی کے اندر اندر دیکھتے دیکھتے مغل حکومت کا اقتدار جاتا رہا۔ نظم و نسق حکومت میں بالکل اتہری پیدا ہو گئی۔ ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ مختلف صوبوں میں مقامی سیاسی طاقتیں سر اٹھانے لگیں۔ پھر ان سیاسی طاقتوں کے ساتھ مقامی تہذیبوں نے بھی بال و پیر لگانا شروع کیے۔ اور وہ سب بدعات اور منہ و انہ رسوم جو اورنگ زیب کی کوششوں سے دب گئے تھے، از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔ شیعیت بھی آخری کمزور بادشاہوں کی سرپرستی میں پھر سر چڑھنے لگی۔ عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف نہ پہلے توجہ کی گئی اور نہ اب۔ اپری قوم حکومت و امرائے حکومت کے سہارے جیتی رہی۔ جوں ہی حکومت کمزور ہوتی نظر آئی، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ علماء اور صوفیہ کی روش میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ مدرسوں کا نظام تعلیم اسی پرانے ڈگر پر چلتا رہا۔ کتاب و سنت سے بے پروائی اپنے حال پر قائم رہی۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف چھ سات سو برس کی رچی بسی ہوئی خرابیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک فقیر اور ایک شہنشاہ کی کوششیں۔ اگر اورنگ زیب کے جانشین جاندار اور ہوشمند ہوتے تو شاید اصلاح و تجدید کا یہ ارتقاء جاری رہتا۔ مگر ان کی کمزوری اور نااہلی نے نقشہ ہی بدل دیا۔ حالات

بد سے بدتر ہو گئے اور پھر ایک مصلح و مجدد کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ان حالات اور اس ماحول میں شاہ ولی اللہ نے آنکھیں کھولیں اور سقن رشد کو پہنچتے ہی ازبر نو اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے سامنے مکمل دین تھا اور اسے تمام پہلوؤں سے اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ اور غیر اسلامی افکار کی تنقیح و تنقید بھی ان کے مشن کے اہم اجزاء تھے۔ اس عظیم اٹان کام کے لیے جس علم اور غم و محنت کی ضرورت تھی، وہ انہیں پوری طرح حاصل تھی۔ ہم ان کے کارناموں کو حسب ذیل موٹی موٹی قسموں میں بیان کر سکتے ہیں:-

۱، ہمایوں کے زمانے ہی سے شیعیت کا زور شروع ہو گیا تھا اور دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ شاہ صاحب نے ازالۃ الخفا لکھ کر عملی طور پر یہ محبت تمام کر دی، نیز اسلامی حکومت کی خصوصیات اُجاگر کیں۔

۲، اب تک علماء عظیم کلام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب نے انہیں حدیث و فقہ کی طرف توجہ دلائی اور اسراذیمہ نعیت پر حجتہ اللہ البالغہ لکھ کر ان کے خیالات کی تصحیح کی۔

۳، بارہویں صدی ہجری سے پہلے ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم گویا نصاب سے خارج تھی۔ انہوں نے اصول تفسیر میں ایک گراں قدر کتاب الفوز المکیہ لکھ کر کتاب اللہ کے درس و مطالعہ کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے عام لوگوں کے لیے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی۔

۴، تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور تحقیق و اجتہاد کے عملی نمونے پیش کیے۔ نیز مجتہدین کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی اور ائمہ کے مختلف فیہ اقوال کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ حجتہ اللہ البالغہ اور الانصاف میں اس باب کے خاص مباحث ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ذہن خود بخود کتاب و سنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد سے ابا کرتی ہے

۵، حدیث نبوی کا خزانہ عام کرنے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ مؤطا امام مالک

کی عربی و فارسی میں دو مشرعیں لکھیں، اور دوسری چھوٹی تصنیفات کے علاوہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گئے جن کے فیضِ علم سے ہندوستان کا چھپو چھپو "حَدَّثَنَا" اور "أَخْبَرَنَا" کے ہمہوں سے گونج اٹھا۔

صاحبزادے اور شاگرد | شاہ صاحب کی خوش نصیبی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے بالمال فرزند اور شاگرد عطا فرمائے، جو ان کے بعد ان کے مشن کی تکمیل میں لگے رہے اور پھر انہی کی تعلیم سے ناسخ ہو کر اور انہی کے خاندان میں وہ سر فرخس مجاہد بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے شہادتِ حق کی راہ میں اپنے جان و تن کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کے چاروں صاحبزادے، شاہ عبدالعزیز (۱۲۳۹ھ)، شاہ رفیع الدین (۱۲۳۳ھ)، شاہ عبدالقادر (۱۲۳۵ھ) اور شاہ عبدالغنی (۱۲۳۶ھ)

سب کے سب یگانہ روزگار اور مرجع خواص و عوام تھے۔ ان کے دم سے ہندوستان میں کتاب و سنت کا چرچا بٹوا۔ ان کی تصنیفات اب تک علماء اور طلبہ کا مرجع و ماخذ ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن آج تک معیاری اور اپنی آپ مثال ہے۔ اسی طرح ان کے نو سے شاہ محمد اسحاق (۱۲۶۲ھ) نے بھی ایک مدت تک مسندِ ولی اللہی کی روایات قائم رکھیں اور ان کے چشمہِ علم سے عرب و عجم کے ہزاروں افراد سیراب ہوئے۔ شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں عرف چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ تو عمر ہی میں وفات پا گئے۔ اور اس لیے انہیں اپنے دوسرے جانیوں کی شرحِ کلام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن قدرت کے انداز نزلے میں۔ ان کے صلب سے وہ یگانہ روزگار مجاہد پیدا ہوا جس نے دادا کے ادھورے کام کی تکمیل کی اور اسلامی ہند کی تاریخ پر ایسا نشان چھوڑ گیا جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتا۔ آگے کی سطروں میں ان کے کارناموں کی طرف ضروری اشارے آتے ہیں۔

شہیدین | اب تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی ہند میں اصلاح و تجدید کی ابتدا حضرت مجددِ مہندی سے ہوئی۔ شاہ صاحب نے ان سے آگے بڑھ کر ایک مکمل فکری و علمی تجدید و انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن خود وہ انقلاب برپا نہ کر سکے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ذہنوں کی صفائی اور انکسار و نظریات کی تنقیح و تنقید میں بسر ہوا۔ یہ کوئی سیرتِ انگیرہ بابت نہیں۔ قوموں کی تاریخ میں ایسا ہوتا آیا ہے۔

شاہ صاحب کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والوں اور خود ان انہی کے خاندان میں، ایسے اللہ کے بندے نکل آئے جنہوں نے ان کے مشن کی تکمیل کی۔ دعوت حق کا پرچم بلند کیا اور اس سرزمین میں پہلی مرتبہ اقامت دین کی تحریک برپا کی۔ میری مراد سید شہد بریلوی (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) اور ان کے جانشین مولانا اسماعیل شہید (۱۱۹۳-۱۲۴۶ھ) سے ہے۔ حق یہ ہے کہ ان شہیدانِ راہ حق اور ان کے ماننے والوں اور ان کے نقش قدم پر گھر بار لٹانے والوں نے اس ملک میں ایک باوجود صحابہ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کا مقصد اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اس کی شریعت کو اس کی زمین پر نافذ کرنا تھا۔ اور اس مقصدِ عظیم کے لیے انہوں نے ہر ممکن قربانی کی۔ بنگال سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد تک، زمین کا چپہ چپہ ان کی قربانیوں اور فداکاریوں پر گواہ ہے۔ چرخ کج رفتار ان شہیدانِ راہ حق کے کارناموں کو بھلانا بھی چاہے تو کیسے بھلائے؟

ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد یہ عشق

ثبت است بر حسب یدۃ عالم و داعم ما

اس تحریک تجدید و جہاد کے بارے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک تھی جو صحیح اسلامی نصب العین کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی اور آخر دم تک اپنے مقصد پر قائم رہی۔ اس کی برکت اور اس کے علم برداروں کے دم قدم سے توحید و سنت کا جو بول بالا ہوا اور بدعات و مشرکاتہ رسوم کا جس طرح استیصال ہوا، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں مختصر یہ سمجھیے کہ آج اس برصغیر ہندوستان میں ایمان و عمل کی جو بُری بھلی متاع پائی جاتی ہے وہ انہی مردانِ حق کا فیض ہے اور انہی کے آفتابِ علم و عمل کا پرتو۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ مشہدِ بالا کوٹ کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اور اب تو یہ کوئی دھماکی چھپی حقیقت نہیں کہ سید صاحب کی شہادت، یعنی ۱۲۴۶ھ سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک سید شہید کے ماننے والے اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والے پوری طرح سرگرم عمل رہے اور برطانوی پولیس اور فوج کی تمام چنگیز سامانیوں کے باوجود اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

۱۸۵۷ء | ابھی سید صاحب کی تحریک ملک کے اندر اور باہر منظم طریقہ پر جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ تو نہیں انقلاب رونما ہوا، جس نے اس ملک کی کایا ہی پلٹ دی۔ مسلمان اس مہم میں آگے آگے تھے اور حکومت انہی کے ہاتھوں سے گئی تھی، اس لیے وہی اس انقلاب کا خاص طور پر شکار ہوئے۔ بدیسی حاکموں نے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور طرح طرح کی آزمائشوں اور مشکلات میں ڈال کر ان کا وجود و عدم برابر کرنے کی کوشش کی۔

دینی حیثیت سے بھی اس انقلاب کے نتائج کم خطرناک نہیں ثابت ہوئے۔ وہ قوم جو ہمیشہ حکومتوں کے سہارے جیتی رہی اور بس کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا کبھی کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا گیا، اور جس کے ذمہ دار اور مرقہ الحال طبقے کی بنیادی کمزوریاں پچھلی صدی کی کشمکش میں پوری طرح ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس سے یہ توقع ہی کب تھی، کہ وہ انقلاب اور اس کے خطرناک نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گی؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک افراتفری پیدا ہوئی۔ ایک طرف سے "چلو تم اُدھر کو ہو اہو جھڑ کی" کا نعرہ بلند ہوا۔ فرنگیت نوازی کا یہ نعرہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رہا۔ تعلیم و تربیت سے لے کر مذہب و اخلاق تک سب اس کی لپیٹ میں آگئے۔ ہمیں یہاں خاص طور پر دینی افکار سے بحث ہے۔ مگر سید اور اس کے ہمناظران نے اس سلسلے میں جو غلطیاں کیں، آج تک ان کی تلافی نہیں ہو سکی۔ سیاسی مرجعیت نے ان کے دل و دماغ ماؤف کر دینے تھے۔ وہ ہر چیز کو مفتوحانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کی تبلیغ و تحریر سے دین کے باب میں ایک شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوئی، جس کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ایک محدود طبقے میں اب بھی باقی ہیں۔

سید احمد خاں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے محمدن اینگلو اور ٹیل کلج کی بنیاد رکھی، اور دوسری طرف اس شکست خوردہ ذہنیت کے رد و فصل کے طور پر دیوبند کی درس گاہ قائم ہوئی۔ علی گڑھ اور دیوبند میں صرف دو درس گاہوں کی بنیادیں نہیں رکھی گئیں، بلکہ دو متضاد اور مختلف مکاتب فکر کے مستقل مرکز قائم ہوئے۔ ایک نے مسلمانوں کو علوم ہمدیدہ سے آگاہ کر کے اگر ایک مفید کام کیا، تو اس کے ساتھ ان کو مغرب کی ذہنی غلامی اور عملی تقلید کا روگ بھی لگا دیا۔ دوسرے نے مسلمانوں کی

علمی اور دینی میراث کو بچا کر اگر ایک اہم خدمت انجام دی، تو اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کے موروثی جمود کو بھی برقرار رکھنے کا فریضہ بٹوا، اور اس نے دنیا اور زمانے کی ضروریات سے گویا آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کشمکش صرف دیوبند اور علی گڑھ، دو مقامات تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ جہاں کہیں بھی نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے، انہوں نے سرسید کی پالیسی کو اپنی مشعل راہ بنایا، اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا، عام جمود اور مسائل حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند ہی کے نقش قدم پر رہی۔

یہ کشمکش عرصہ تک چلتی رہی، تا آنکہ دونوں قسم کی درس گاہوں سے ایک بڑی تعداد لکھ پڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی، اور اہل فکر و نظر کو احساس ہوا کہ اگر اس خلیج کو پاسٹے کی فرمی کو شش نہ کی گئی، تو اسلامی ہند بالکل دو متضاد اور مخالف گیمپوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا اور کسی متحدہ جدوجہد کے شروع کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اس احساس نے ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کی۔ لکھنؤ میں اس کا دارالعلوم قائم ہوا، اور نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ طالب علم علوم دین اور عربی زبان و ادب میں بھارت کے ساتھ دنیا اور اس کے مسائل سے بھی بے خبر نہ رہے۔ آگے چل کر اس نے دیوبند اور علی گڑھ کی انتہا پسندی کے درمیان ایک بین بین مسکب اعتدال کی شکل اختیار کر لی۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایسی درس گاہیں قائم ہوئیں جو اس کے طریقہ تعلیم و اصلاح سے متاثر تھیں، اور ایسے اہل علم اور اہل قلم تو شمار میں نہیں آسکتے، جو اس کے ٹیر پھر سے متاثر، فکری اور ذہنی طور پر اس سے قریب اور اس کے تہذیبی رجحان سے ہم آہنگ کہے جاسکتے ہیں۔ ندوہ کی ایک اور خصوصیت ہے۔ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے عربی زبان و ادب کی اہمیت پر زور دے کر اس نے عرب ملکوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ان ملکوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت بہم پہنچائی اور اپنے ملک کے حالات و مسائل سے ان ملکوں کو روشناس کر آیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دور میں جب کبھی اسلامی ہند کو دنیائے اسلام اور خاص کر عرب ملکوں سے رشتہ الفت استوار

کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اسی درگاہ کے تربیت یافتہ کام آتے ہیں، اور آئندہ بھی غالباً یہی اس کام میں آگے ہوں۔

نئے مفکرین | یہ تین مکاتب فکر بیسیویں صدی کے ابتدائی حصے تک یہاں پوری طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اور مسلمان ملکوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑنے لگی۔ سید جمال الدین افغانی انتقال کر چکے تھے۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء)۔ لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ تھے۔ سلطان عبدالحمید مغرول ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ان تھک پر وہیگنڈے کے اثر سے مسلمانان عالم کو عثمانی حکومت سے خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ ترکی انقلاب کے بعد ہی طرابلس اور بلقان میں جنگ اور بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور پھر پہلی جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہوتے مسلمانان ہند کی محبوب ترکی حکومت برطانیہ و فرانس اور روس کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑی۔

ان بین الاقوامی حالات کا ہندوستان میں اسلامی فکر کی نشوونما اور ارتقاء پر گہرا اثر پڑا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں جاندار سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ قدرتی طور پر نئے رجحانات کی قیادت اور نئے افکار کی تربیت و پرورش کے لیے دو نئے مفکر منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نے نئے نئے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دوسرے نے نظم کو۔ ایک نے کتاب سنت کو اور دوسرا بچھوٹا بنایا۔ دوسرے نے اسلام کی باطنی روح کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ میری مراد ابوالکلام اور آقبال سے ہے۔ ابوالکلام کا یہ دور دعوت و جہاد ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۷ء تک، بلکہ اس کے کچھ بعد تک قائم رہا۔ اور اس دوران میں ان کے خطبوں اور مقالات سے ہزاروں اور لاکھوں آدمی نہ صرف متاثر ہوئے، بلکہ ان کی زندگیاں بدل گئیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کے سانچے تبدیل ہو گئے۔ مگر آہ بیکہ جس نے اپنی غیر معمولی شخصیت اور جہز نما تحریر و تقریر سے لاکھوں نیند کے ماتوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، اور ہزاروں دلوں میں ایمان کی نغم ریزی کی، آہستہ آہستہ خود فکر و عمل کے اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں مخلص سے مخلص عقیدت مند کے بیٹے ہی اس کے قول و فعل کی توجیہ مشکل ہو گئی۔

اس کے برخلاف اقبال کی روش کیساں اور ان کا فکری ارتقا مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے جو فکر و نظر لے کر وہ آئے تھے، اس میں برابر جلا ہوتی رہی، اور حلقہ نقیض و استفادہ بڑھتا ہی گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اقبال کے فکر و نظر اور ان کی تصنیفات سے اسلامی فکر کی تشکیل و پرواخت میں بڑی مدد ملی ہے۔ اور اپنی عمر کے آخری سالوں میں 'قادیانیت' کے خلاف ان کا جہاد تو اسلامی ہند کی تاریخ میں آپ زور سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سیاستی تحریکوں کا اثر | طرابلس و بلقان کے۔۔۔ فرس حادثات سے لے کر تحریک خلافت تک مسلمانان ہند میں جو سیاسی بیداری اور فداکاری کا جذبہ پیدا ہوا، اس کا بھی اسلامی فکر و تحریک پر اچھا اثر پڑا۔ ان تحریکوں میں جو لوگ آئے، وہ قلب و جسم ہر لحاظ سے مسلمان ہو کر آئے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدل گئے۔ ان خلافتی لیڈروں کے لیڈر مولانا محمد علی جوہر تھے اللہ ان کی تربیت پر غفران و رحمت کے پھول برسائے، دورِ حاضر کے سیاست کاروں میں وہ ایک فرد فریدی تھے جن کا دل اسلام کی سچی محبت سے معمور تھا، اور جن کا معیار رد و قبول اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں تھا جب تک ان کے ہاتھوں میں زمام قیادت رہتی، مسلمانوں کی سیاسی گاڑی اگر اسلام کے نصیب العین کی طرف نہیں، تو کم از کم اسلامی طرز پر چلتی رہی۔ لیکن یہ تبدیلی ویران ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں ترکوں نے نظام خلافت کا ٹٹھاتا ہوا اپرناج بھی گل کر دیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال (ذات ترک)، اور امان اللہ خاں کی تجد و نوازیوں سے ہمارے ہاں کے مغرب پرست چلتے کوشہ ملی۔ دوسری طرف علمائے کرام یا تو سیاست کو سول دور چھوڑ گئے تھے یا تحریک خلافت کے زمانے سے سیاست میں دخیل ہوئے تو اپنے بنیادی فرائض کو بھی بھول گئے۔ اور پھر یہ کہ میدان سیاست کے شعبہ بازوں میں جو ایک مرد مومن تھا، وہ دنیا کے غم و آلام سے چور۔ ۵۲ سال کی عمر ہی میں اپنے مالک و آقا کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ (سن ۱۹۲۷ء) خاکِ قدس اور ابہ آغوشِ متنا در گرفت سوئے گردوں رفت نانا رہے کہ پیغمبرِ گزشتہ

راقبال

اب تک بے عمل تھی، بد عقیدگی نہیں تھی۔ لیکن حالات سازگار پارک فکری بغاوت نے بھی سر اٹھایا یہ مسئلہ کا ذکر ہے۔ اس فکری بغاوت کی علمبرداری لکھنؤ کے رسالہ نگار کے حصے میں آئی۔ ساتھ ساتھ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی نئے لباس میں ظاہر ہوا۔ اس ”مولودِ ضعیف“ کی پرورش بھی ابتدائے نیاز ہی کے نگار خانے میں ہوئی۔ پھر اسے امرتسر میں موافق آب و ہوا نصیب ہوئی اور اس کے بعد دہلی کے ایوانِ حکومت میں اسے مستقل مامن مل گیا۔ جو اب تقسیم کے بعد پاکستان کے سکریٹریٹ میں منتقل ہو گیا ہے۔ بد قسمتی سے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک استادِ درجہ اولیٰ علامہ اہل حدیث اور ایک مشہور اہل حدیث عالم کی یادگار ہیں، عرصہ سے اس کے سرپرست بنے ہوئے ہیں۔ فتنہ نگار اور فتنہ انکارِ حدیث کی سیخ کنی کے سلسلے میں جن بزرگوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور ساہا سال تک سنتِ نبوی کے دفاع اور تحفظ کے لیے سینہ سپر رہے، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام ممتاز و نمایاں ہیں۔

تحریکِ خلافت کے اثر سے جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی تھی، اس کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی۔ وہ ایک جذباتی تحریک تھی اور کسی واضح فکر سے محروم۔ اس لیے جوں ہی وہ مخصوص نفسیاتی حالات بدے، عارضی دینداری بھی ختم ہو گئی اور مذہبی بغاوت کی روح جاگ اٹھی، جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اتنے میں ملک کے سیاسی حالات تیزی کے ساتھ بدلنے لگے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس، جس میں آزادی پسند ہندو اور مسلمان سب جمع تھے دیکھتے دیکھتے ہندو قوم پرستی کی علم بردار بنتی چلی گئی اور اس کے اس رویے سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ کانگریس کی اس روش کے باوجود اس سے چمٹا رہا اور اس نے متحدہ قومیت کا ایک نیا نظریہ اختیار کر لیا۔ دوسرا گروہ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے مسلم قومیت، کا علمبردار بنا۔ دونوں گروہوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے ماننے والے ایک پانچ میل مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کے

گن گاتے تھے، جس کے نتیجے میں وطن پرستی کا جذبہ زور پکڑ رہا تھا اور اکبری دور کی ہندو مذہبیت کی طرف مسلمانوں کے پھر لپٹ جانے کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مسلم قومیت کے علم بردار مسلم تہذیب اور مسلم نسل و قومیت کی بنیاد پر ایک نئی تحریک اٹھا رہے تھے، جس میں بظاہر تو اسلام سے وابستگی کا ایک خوشگوار رجحان پایا جاتا تھا، مگر اس کی رفتار صاف تباہی تھی کہ یہ تحریک اسلام کی آئیڈیالوجی کی طرف جانے کے بجائے تیزی کے ساتھ ٹرکی، ایران اور مصر کی طرح محض ایک آزاد مسلم قوم وجود میں لانے کی طرف جا رہی ہے۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ کشمکش دن بدن بڑھتی چلی گئی اور مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ عالمانِ دین کی نمائندہ "جمعیت" نیشنل کانگریس اور اس کی پالیسی کے پر جوش ہم نواؤں میں شامل ہو گئی اور شدت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قومیت کی توفیر تحریک، جس کی لیڈرشپ میں دین کے علم اور دینی رجحانات کی پہلے ہی بہت کمی تھی، علماء سے برسرِ جنگ ہو گئی اور اس چیز نے صرف علماء ہی کا استغفاف نہیں کرایا، بلکہ ان کے ساتھ علم دین اور دین کے اثر کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ آویزش جانے کہاں جا کر دم لیتی، اگر اس کے خلاف اسلام اور دین حق کی بے لاگ آواز بلند نہ ہو جاتی۔ ایک درو مند صاحب علم نے آنے والے حالات کا بروقت اندازہ لگالیا تھا، اور ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد وکن سے رسالہ ترجمان القرآن جاری کر کے دعوتِ حق کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی چار پانچ سال افکار و خیالات کی تنقیح اور اسلامی فکر و دین کے متعلق گونا گوں غلط فہمیوں کے ازالے میں صرف ہوئے۔ ابھی یہ تنقیح و تنقیح کا کام جاری تھا کہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ہندوستانی وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی کشمکش طوفانی شکل اختیار کرنے لگی اور وقت آگیا کہ اسلام کی سچی اور بے میل دعوت ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس موقع پر مدیر "ترجمان" نے پہلے ہندوستانی وطن پرستی کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور آج صرف موافق ہی نہیں، مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر ترجمان القرآن

کے بے پناہ مقالات نہ ہوتے تو متحدہ قومیت کا جنازہ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی قومیت کے خلاف ترجمان القرآن کے مسلسل حملوں سے مسلم لیگ اور مسلم قومیت کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور ان مضامین کو گھر گھر پھیلانے میں لیگی حضرات نے پورا تعاون کیا۔ مگر جوں ہی اس مہم کی دوسری منزل سامنے آئی اور مدیر ترجمان القرآن نے مسلم قومیت کی کمزوریاں اور اس کے علم برداروں کی بے اعتدالیاں دکھانا شروع کیں اور اسلام کی راہ راست سے ان کا انحراف، عام مسلمانوں پر واضح کیا، تو پھر اس غریب سے زیادہ بُرا کوئی نہ تھا! گو با اسلام سے محبت نہیں، اپنی قومیت اور عادات و رسم و رواج زیادہ محبوب ہیں۔ جب تک شرک خالص کی مذمت کی جائے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے نعرے بلند ہوں، اور جہاں ان جاہلی رسوم اور عادات کی نشان دہی کی جائے جو اسلامی سوسائٹی میں راہ پاگئی ہیں، تو جبین ناز پرٹنکنیں پڑ پڑ جائیں۔ یہ طالبانِ حق کا شیوہ نہیں، یہ تو بگڑی ہوئی قوموں کے لچھن ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مدیر ترجمان القرآن نے ہندوستانی قومیت کی بیخ کنی سے فارغ ہوتے ہی فوراً اپنی کوششوں کا رخ صاف اور بے لاگ اسلام کی دعوت کی طرف موڑ دیا، تاکہ مسلم قومیت کی تحریک کو اتار کر ہی اور رضا شاہی کی طرف جانے سے روکا جائے اور مسلمانوں میں زندگی کی جو نئی حرکت پیدا ہوئی ہے، اُسے اقامتِ دین کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ یہ کوئی نئی دعوت نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء اسی کی دعوت دیتے آئے ہیں اور ان کے بعد امت کے تمام مصلحین کے پیش نظر یہی چیز رہی ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی بے لاگ دعوت کا خود اس کے دم بھرنے والوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے استقبال نہیں کیا ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے، اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ نیزنگیاں ظہور میں آرہی ہیں۔ اس لیے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۳۹ سے ۴۰ تک مدیر ترجمان القرآن انفرادی طور پر اللہ کے دین کی طرف

بلاتے رہے اور اقامت دین کی منظم جدوجہد کے لیے لوگوں کو آمادہ عمل کرتے رہے۔ جن نیک اور باہمت بندوں نے پہلے پہل اس دعوت کا خیر مقدم کیا اور صلے لبیک بلند کی، انہوں نے سلسلہ میں اپنے کو ایک اسلامی جماعت کی صورت میں منظم کر لیا۔ اور مدیر ترجمان القرآن بالاتفاق اس کے امیر منتخب ہوئے۔

سلسلہ سے سلسلہ تک مسلسل جدوجہد اور دعوت کی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ دوسری اسلامی تحریک تھی جو صحیح اہمیتوں پر شروع کی گئی۔ اس کے نصب العین، طریق کار اور پروگرام پر خاصہ لٹریچر موجود ہے جسے پڑھ کر اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس جماعت نے پوری کوشش کی کہ مسلمان اقامت دین کے نصب العین پر جمع ہو جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم قوم پرستی اور ہندو وطن پرستی کی کشمکش اپنی راہ پر بڑھتی رہی اور اس کا انجام بڑھتی ہوئی اندرونی کشمکشوں کی پیدائش میں روٹنا ہوا۔ ایک بھارت جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا گیا اور وہاں کے مسلمان پوری طرح مغلوب ہو گئے۔ دوسرے پاکستان جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور سابق ہندوستانی مسلم قوم کے نصف سے کچھ زائد حصے کو یہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ اگر وہ مسلم کو نہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس تقسیم کے بعد اسلامی تحریک کی علم بردار جماعت بھی تقسیم ہو گئی۔ اس کے جو کارکن تقسیم کے وقت بھارت میں تھے، وہ ایک الگ جماعت بن گئے، اور آج جس تین دہی اور ثابت قادی کے ساتھ انتہائی نامساعد حالات میں وہ دعوت دین حق کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے قابل رشک ہے۔ اللہ کی شان کہ جو علمائے دین بڑے بڑے آستانوں کے مند نشین ہیں، ان کی آنکھیں تو متحدہ قومیت کے بدترین نتائج دیکھنے اور بھگت لینے کے بعد بھی نہ کھلیں، بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک شدید تر ضلالت، یعنی لادینی رسیکو لوزم، کے حامی بن گئے، مگر جن لوگوں کے سر کی وارالعلوم

کی دستاویزیلیت سے عزیز نہیں ہیں، وہ آج بھی سرزمین ہند میں وطن پرستی اور سیکولرزم کی تردید کر رہے ہیں اور نظام حق کے قیام کی دعوت دیتے جا رہے ہیں۔ پھر اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ دینی آستانوں کے مسند نشینوں کو ان سرفروش بندگان حق کی جراثیم دیکھ کر شرم تو کیا آتی، وہ آج آٹھے اس بات پر تڑپتے ہوئے ہیں کہ اُس ایک آواز کو بھی بند کر دیں جو بھارت میں حق کے لیے بلند ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بلند ہونے سے انہیں اپنی مذہبی ساکھ کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔ تاریخ میں یہ عجز یہ بھی یاد گار رہے گا۔ کہ متحدہ قومیت اور لادینی جمہوریت کے علمبردار تو قرار پائے ہیں مسلمان، اور ان کے دارالافتادوں سے گمراہی اور بے دینی کے فتوے جاری ہو رہے ہیں اُن لوگوں کے حق میں جو آج اس انتہائی خطرناک دور میں بھی بھارت کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کو اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دینے سے نہیں چوکتے۔

یہ تو ہے بھارت کی اسلامی تحریک کا حال۔ رہا پاکستان، تو یہاں تقسیم کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے نام سے ایک انگ نظام جماعت بن گیا۔ اور اس نے حال و مقام کی مناسبت سے ایک دوسرا پروگرام اختیار کیا۔ یہاں ایک مسلم قوم آباد ہے اور اسے حاکمانہ اختیارات حاصل ہیں اس لیے یہاں کی جماعت نے تقسیم کے بعد تارکان وطن اور پناہ گزینوں کی امداد و خدمت کے کام سے فارغ ہوتے ہی مطالبہ نظام اسلامی کی مہم شروع کر دی، جو ارباب اقتدار کی تمام ناراضگیوں کے باوجود جاری رہی اور آخر اس مطالبہ کی مہم نے انہیں قرار و مقاصد پاس کرنے پر مجبور کیا، جو اصل میں اس ریاست کے مسلمان ہونے کا باضابطہ اعلان تھا۔

قرار و مقاصد کے بعد جماعت کا کام دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف وہ عام دعوت اور منظم تبلیغ و تلقین سے معاشرے کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کرنے میں لگی ہوئی ہے، تاکہ اسلامی قانون کے نفاذ و اجراء کے لیے مناسب و موزوں فضائیاں ہوں۔ دوسری طرف وہ قرار و مقاصد کے نفاذ کے مطابق نظام حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہی ہے، تاکہ حکومت کا دستور بھی اسلامی ہو اور ملک کا قانون بھی اسلامی۔ اور پھر اس پر عملد آد کرنے کے لیے ایسے لوگ ملک میں برسر اقتدار

آئیں جن کی ذہنیت اور سیرت بھی اسلامی ہو۔ اس کام میں جو طبقے جماعت اسلامی کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان میں سے مغرب زدہ طبقے کی مزاحمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ اسلامی نظام کا قیام ان کے طوائف نظر مایت اور ان کی فاسقانہ عادات کے خلاف ہے۔ اٹنر کی گروہ کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جاری ہو گا، ہاں مارکس اور لینن کا طریقہ جاری نہ ہو سکے گا۔ گمراہ فرقوں کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے فروع کا امکان اسی وقت تک ہے جب تک یہاں کتاب و سنت سے بے نیا ہو کر کام کرنے والی ایک فاسق قیادت موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی مزاحمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ ان علماء کرام کی مزاحمت ہے جو خود کہتے ہیں کہ شریعت کی فرمانروائی انہیں مطلوب ہے، خود کہتے ہیں کہ فسق و فجور کا یہ طوفان انہیں گوارا نہیں ہے، مگر جب اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی آگے بڑھ کر جدوجہد کرتی ہے تو وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں اُس فاسق قیادت کے ساتھ ہوتی ہیں جو یہاں اس وقت ہر منالیت اور ہر فسق کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرز عمل کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ مگر ہمیں اس کا کوئی جواب معلوم نہیں ہے۔ شاید یہ راز اس دنیا میں راز ہی رہے گا، مگر ایک دن بہر حال آئے جس میں سارے ہی رازوں سے پردہ اٹھ جائے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ

• امن عالم کا ضامن • فلاح انسانیت کا پیغامبر • پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد اخبار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الافصاف آپ کا بہترین رفیق ثابت ہو گا۔ خود پڑھیے دوسروں کو پڑھائیے۔

زر تعاون: سالانہ ۱۰ روپے۔ ہفت روزہ ۱۰ روپے۔ ذمہ دار: افصاف ۱۳۵ شاہ گنج
الآباد دہلی۔